اقبال
نفسیاتِ اطفال کے ماہر

محمد قاسم یعقوب

کسی بھی معاشرے کی سماجی سرگرمیوں میں بچے کلیدی کردار ادا کرتے ہیں بچوں کی حیثیت اس لیے بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ وہ آنے والے کل کے حکمران ہوتے ہیں یوں بچے ایسے پہاڑی چشمے ہوتے ہیں جنھیں آگے چل کر میدان سیراب کرنے ہیں لیکن اس حقیقت کے ساتھ ساتھ بچوں کے مزاج میں قوتِ ارادی کا شعوری عمل دخل نہیں ہوتا جو اُنھیں کسی نصب العین کی تکمیل کی طرف گامزن کر سکے۔ بچوں کا ایک خاص ذہنی پھیلاؤ اور ایک خاص طرز پر ڈھلی ہوئی حرکات اُنھیں ایک نفسی دائرے میں مقید رکھتی ہیں۔ بچے اس سائیکی کے پیش نظر ایک جیسے ہوتے ہیں اپنے فطری میلانات کے باعث اُن کی سرگرمیوں میں زیادہ تنوّع نہیں پایا جاتا۔ کھیلنا، ہنسنا، چھیننا، جھپٹنا، جھگڑنا، پچھتانا، رونا، ڈرنا، ضدی پن غیر سنجیدگی اور اس طرح کی بہت سی فطری عادات کم وبیش دنیا بھر میں ہر نسل کے ہر بچے میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔

حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے:

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے والدین اُسے یہودی و نصرانی بنا دیتے ہیں

احمد ندیم قاسمی نے بھی اسی مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے:

وہ اعتماد ہے مجھ کو سرشت انساں پر
کسی بھی شہر میں جاؤں، غریب شہر نہیں[۱]

ہر آدمی کی سرشت ایک ہے وہ ایک ہی سانچے میں تیار ہوا ہے اس کی فطرت کا معیار جُدا جُدا نہیں بچے کا غیر متعصّبانہ مزاج اس کو ودیعت کیے گئے نرم رویوں کا عکاس ہے یہی وجہ ہے کہ Free Child کے بارے میں اسلام کا نظریہ نہایت واضح، دوٹوک اور تعمیری پہلوؤں پر استوار ہے۔

یہاں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے دو عظیم فلسفیوں: جان لاک (۱۶۳۲ء۔۱۷۰۴ء) اور جبکہ Roasseau کا حوالہ بہت مناسب ہوگا دونوں کے ہاں بچے کی فطرت کے متعلق متضاد بیان ملتے ہیں۔ Michael Cole اپنی کتاب The Development of Children میں دونوں فلاسفہ پر بحث کرتا ہے Locke کے بارے میں لکھتا ہے۔

He believed that children are born with different temperaments and prefrencies.[۲]

جبکہ Rousseau کی کتاب Emile پر تبصرہ کرتے ہوئے Cole اس نتیجے پر پہنچتا ہے۔

> Rousseau asserted that natural man was not born in sin but corupted by civilization. In the state of nature, all people were equal; inequality appeare with the rise of agriculture, industry and property.[۳]

دونوں کے نظریات پر خاصے عرصے تک علمی بحث چلتی رہی مختلف مکاتب فکر کا جھکاؤ کبھی روسو اور کبھی لاک کے دعووں کی طرف رہا۔ مگر جدید نفسیات کے تحقیقاتی نتائج سے یہ ابہام دور ہو گیا ہے کہ قدرت بچوں میں فطری فرق رکھتی ہے۔

بچہ چونکہ فطرت کے قریب ہوتا ہے اس لیے اس میں خود ارادی جذبات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں وہ اپنی جبلتوں کے اظہار پر مجبور ہوتا ہے۔ انسانی جبلتوں میں مندرجہ ذیل تین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

(۱) تحفظِ زندگی (Protection of Life)

(۲) بھوک (Hunger)

(۳) جنس (Sex)

یہ جبلتیں ہر انسان کی ارادی قوتوں کا مرکز ہوتی ہیں۔ بچہ فطرت میں رہتا ہے لہٰذا اُس کے اندر یہ جبلتیں پوری طرح عیاں ہوتی ہیں۔ مگر تجربات کا رنگ جب شخصیت پر چڑھنا شروع ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ انسان میں ان کا اظہار کلی سے تبدیل ہو کر ثانوی سطح پر چلا جاتا ہے۔ مثلاً بھوک لگنے کے باوجود انسان بچے کی طرح روتا نہیں۔ یا کسی مقصد کی خاطر وہ بھوک کو خیر باد کہہ دیتا ہے اور کسی نازک صورت حال کا سامنا بھی کر گزرتا ہے۔ اس طرح شہدا کے نظریات میں تحفظِ زندگی سے بڑا مقصد تسلیم زندگی بن جاتا ہے۔ جو ان کے تجرباتی پھیلاؤ میں شامل جذبات کا عکاس ہے۔ اقبال نے ''زندگی'' کی جو شکلیں دکھائی ہیں وہ جبلّی خطوط پر ممکن نہیں۔ بلکہ تحفظ زندگی کے جذبے کو پس پشت اٹھا کر پھینک دینے سے عمل میں آتی ہیں۔ اسی طرح جنس کے اظہار کا وہ رویہ جو بچپن میں ہوتا ہے Maturity میں یہ نئے روپ اور نئے معیار میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ گویا یہ جبلتیں انسان میں مرتی نہیں بلکہ ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ یوں ساری عمر جبلتوں کا کلی اظہار کرنے والا بچہ ذات کے اندر موجود رہتا ہے۔

یوں جبلتیں بڑھاپے میں دوبارہ نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور اس طرح زندگی کی یہ قوس اپنا دائرہ مکمل کرتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ فطرت ہی کے خدوخال دوبارہ انسانی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بچپنا بلوغت کے بعد ختم ہو جاتا ہے یا غائب؟ یہ سوال ایک نئی بحث کو جنم دیتا ہے۔ مگر اس کے جواب کا ہلکا سا اشارہ اوپر کیا جا چکا ہے کہ انسانی جبلتیں جن کا کلّی اظہار بچے کی سطح پر پایا جاتا ہے بلوغت کے بعد وہ ثانوی درجے پر چلی جاتی ہیں یوں یہ بچہ کسی نہ کسی شکل میں اپنا عکس روح کے آئینہ خانوں میں دکھاتا رہتا ہے۔

ذرا سے درد پہ زارو قطار رونے لگے
میں اندر اپنے، وہ بچہ تلاش کرتا ہوں

جسم ایک ایسی حقیقت ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جسم کے ساتھ ساتھ خواہشات بھی نئے رخ سے حالات کی منتظر رہتی ہیں اور اندر داخل ہوتی رہتی ہیں عہد طفولیت میں بچے کے ذہن میں جو خواہشات جنم لیتی ہیں وہ ایک سی نوعیت کی ہوتی ہیں۔اس عہد میں بچے پر تہذیبی وسماجی وجغرافیائی خدّ و خال اثر انداز نہیں ہوتے۔مثلاً کوئی افریقی جنگلی بچہ کسی ہاتھی پر بیٹھنے کی ضد کرے گا تو کوئی ہندوستانی بچہ غبارہ لینے کی ضد کرے گا۔یعنی دونوں بچے اس کے باوجود کہ وہ مختلف جغرافیائی ماحول میں پرورش پا رہے ہیں ان میں ضد کرنے یا خواہش کا درجہ ایک ہے۔مگر بلوغت کے بعد یہ روّیے ایک سے نہیں رہتے حالانکہ منجھلے، جواں ، بوڑھے دنیا کے کس معاشرے کی کس تہذیب میں نہیں پائے جاتے مگر جغرافیائی خدّ وخال ہم عمر ہونے کے باوجود ان کے فکری خدّ وخال میں تفاوت کی لکیر کھینچتا ہے بلکہ بلوغت کے بعد تمام عمروں کے انسان جو ایک ہی تہذیبی ماحول میں رہ رہے ہوں ان کے خیالات،ان کی عادات میں بہت سا فرق ہوتا ہے۔

یوں عہد طفولیت ایک ایسا وقت ہوتا ہے جس میں بچے کا (Psychological behaviour) فطرت کے نرم جھونکوں کے سہارے پر ہوتا ہے بچے کی ان مخصوص نفسیاتی عادات کو شاعری میں ایک دبستان کی حیثیت حاصل ہے دنیا بھر کے شعر وادب میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا۔اردو شاعری میں بھی یہ ایک مستقل موضوع جو کلاسیکل روایات سے چلتے ہوئے اقبالؒ اور دور جدید تک کے شعرا میں ملتا ہے۔لیکن یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ اقبالؒ سے پہلے شعرا کے ہاں بچوں کی تضادات (Child psychology) خال خال اور مبہم انداز میں ہیں۔اقبالؒ وہ پہلا شاعر ہے جس نے بچے کی نفسیات کو ایک ماہر نفسیات کے طور پر جانچنے کی کوشش کی اور سب سے بڑھ کر اس کو روایتی شعری تجربوں مثلاً جدائی، اضطراب اور آرزو وغیرہ سے ملا کر ایک حسرت انگیز منظر نامہ مرتب کیا ہے۔اقبالؒ کے بعد اس روایت کو ایک دبستان کا درجہ مل گیا۔

یہاں یہ امر بھی بہت اہم ہے کہ اقبال سے پہلے بچے کے لیے نفسیاتی اصطلاح ''لڑکا'' یا ''طفل'' کا استعمال ہوتی تھی۔مثلاً :

اے آنسوؤ، نہ آوے اب دل کی بات منہ پر
لڑکے ہو تم کہیں مت افشائے راز کرنا

(خواجہ میر درد)

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا ، دیدۂ بینا نہ ہوا

(مرزا غالب)

ہمارا موضوع اقبال کا وہ اردو کلام ہے جس میں بچے کی نفسیاتی بحث کو منظوم کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے ہاں بچوں کے حوالے سے تین طرح کی نظمیں ملتی ہیں۔

(۱) وہ نظمیں جو بچوں کے لیے سیدھے سادے انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد سبق آموز انداز میں Entertainment ہے اس انداز کی نظمیں صرف ''بانگ درا'' میں ہیں جن کی کل تعداد سات ہے۔ ایک ''مکڑا اور مکھی''، ''ایک پہاڑ اور گلہری''، ایک گائے اور بکری''، ''بچے کی دعا''، ''ماں کا خواب''، ''پرندے کی فریاد''، ''ہمدردی''۔ بانگ درا ہی میں آگے چل کے ایک نظم ''ایک پرندہ اور جگنو'' بھی نظر آتی ہے۔ جس کا سارا موضوع مذکورہ بالا نظموں والا ہے۔ آسان الفاظ ہیں اور ہلکا پھلکا سبق آموز انداز ہے۔ نظم رواں دواں ہے۔ پوری نظم پرندے اور جگنو کے مکالمے پر ہے۔ مگر تعجب ہے کہ اقبالؒ نے اس نظم پر ''بچوں کے لیے کیوں نہیں لکھا۔ حالانکہ اس طرز کی باقی نظموں پر ''بچوں کے لیے'' واضح طور پر لکھا ہوا ملتا ہے۔

(۲) اقبالؒ کی وہ نظمیں جن میں بچوں سے مصلحانہ خطاب ہے جیسے ''نصیحت''، جاوید کے نام'' (خط آنے پر) ''خوشحال خاں کی دہشت''، ''ہارون کی آخری نصیحت''، ''جاوید سے''، ''طالب علم'' وغیرہ ہم اس طرح کی اور بھی نظمیں کلام اقبال میں نظر آتی ہیں جو ایسے بچوں کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی ہیں جو ابھی بچپنے سے بلوغت میں داخل ہو رہے ہیں۔

(۳) اقبالؒ کے پہلے مجموعہ کلام ''بانگِ درا'' میں ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جو بچے کے نفسیاتی پہلوؤں کی ترجمان ہیں۔ جو بچوں کی نفسیاتی حرکات کو آشکار کرتی ہیں ان میں ''بچہ اور شمع''، ''طفل شیر خوار'' اور ''عہد طفلی'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اقبالؒ نے چند ایک نظموں میں بچے کی نفسیات کو شعری روپ دیا ہے۔ مذکورہ نظمیں ہی ہمارا موضوع ہیں۔

''طفل شیر خوار میں'' علامہ کا تخاطب ایک شیر خوار بچے سے جو ابھی نا سمجھ ہے پوری نظم ایک مکالمے پر مشتمل ہے مگر اس میں شاعر صرف محوِ گفتگو ہے مخاطب حصہ نہیں لیتا۔ شاعر پہلے بند میں ننھے بچے سے مخاطب ہو کے کہتا ہے کہ میں نے تجھ سے چاقو چھینا ہے تو تم چلّانے لگے ہو، یہ اگر چبھ گیا تو بیٹھ کے روٗ گے۔ اگر کھیلنا ہی ہے تو اس کاغذ کے ٹکڑے سے کھیل! جو بے ضرر ہے۔ شاعر بچے کی نفسیات میں اپنی بے قراری وشوقِ جستجو کا سراغ پاتا ہے دوسرے بند میں کہا ہے:

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبار آرزو
آنکھ کھُلتے ہی چمک اٹھا شرار آرزو
ہاتھ کی جنبش میں، طرزِ دید میں پوشیدہ ہے
تیری صورت آرزو بھی تیری نو زائیدہ ہے

چونکہ شاعر کا دل آرزوؤں کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے اسے ہر پل اضطرابی کیفیت کے مدوجزر سے گزرنا پڑ رہا ہے اُسے بچے میں بھی اپنائیت کا احساس ملتا ہے وہ کہتا ہے تیرا دل ایک آئینہ ہے جو آرزو کے غبار سے صاف تھا مگر یونہی تو نے آنکھیں کھولی ہیں یہاں تمناؤں نے کروٹ لینی شروع کر دی ہے مگر یہ آرزوئیں ابھی نوزائیدہ ہیں کیونکہ ان کا اظہار صرف ہاتھ کی جنبش یا آنکھ کے دیکھنے تک محدود ہے۔

تیسرے بند میں شاعر بچے کی فطری عادات کے ساتھ اپنا تقابل پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے تیرا مزاج بھی بگڑتا بنتا رہتا ہے اور میں بھی اس کیفیت میں گرفتار ہوں تو بھی عارضی شے پر مرتا ہے اور میں بھی...... تیری نادانی سے میری نادانی کچھ کم نہیں کیونکہ ہم دونوں ہی ظاہری حسن کی کرشمہ سازیوں سے متاثر ہو جاتے ہیں کبھی میں رونے لگتا ہوں کبھی ہنسنے۔ یوں میں ذہنی سطح پر ایک بچہ بن چکا ہوں۔

شاعر اپنی بے چینی کا عکس بے پروا کھیلتے بچے کے مزاج میں دیکھتا ہے اور آخر میں اپنے اپ کو بھی ایک نادان بچہ ٹھہراتا ہے مگر شاعر اور بچے میں صرف آگہی ہی دونوں میں امتیاز پیدا کرتی ہے شاعر نے اپنے ماج کا سارا پرتو بچے کے انداز فطرت میں پایا ہے۔ مگر بچہ ان کیفیات سے بے خبر ہے جبکہ شاعر جن مضطر جذبات کے شعلوں میں جل رہا ہے وہ اس کے اپنے جذب و مستی کا شعوری تجربہ ہے۔ حکیم آئن سٹائن کہتا ہے کہ میری مثال اُس ننھے بچے کی مانند ہے جو ساحل سمندر پر سیپیوں سے کھیل رہا ہو اور سمندر کی گہرائی سے بے خبر ہو۔ یہاں بھی بچے کا تقابل اپنی ذات کے ادھورے پن یا ناتمامی سے منسوب ہے بچہ سیپیوں سے کھیل رہا ہے مگر سمندر کے معروضی حالات سے ناواقف ہے۔ آئن سٹائن بھی خود کو اسی محرومی کا شکار تصور کرتا ہے۔ بچہ اس ''بے خبری'' سے بے خبر ہے مگر آئن سٹائن اس ''بے خبری'' سے باخبر ہے۔

اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کی دوسری نظم عہد طفلی بھی بڑی بامعنی اور وسعت فکر کو سمیٹے ہوئے ہے۔ پوری نظم میں ذہنی و قلبی واردات کی باز آفرینی کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے زمین و آسمان میرے لیے ایک نئی جگہ تھے۔ جب میں بچپن کی رنگین کائنات میں محوِ تماشا تھا اس وقت ماں کی گود ہی اک نیا جہان تھا ہر حرکت مجھے آرام کا باعث بنتی۔ اس لیے جب میں کبھی روتا تو دروازے کی کنڈی کھٹکنے پر بھی خاموش ہو جاتا:

دردِ طفلی میں اگر کوئی رُلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیر در میں لطف آتا تھا مجھے

دوسرے بند میں بھی انہی یادوں کو شدت جذبات سے دہرایا گیا ہے:

تکتے رہنا ہائے! وہ پہروں تلک سوئے قمر
وہ پھٹے بادل میں بے آواز پا اُس کا سفر

پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ وصحرا کی خبر
اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر!
آنکھ وقفِ دید تھی، لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

غلام رسول مہر اس نظم پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس نظم میں بچپن کی کیفیت بڑے ہی دل کش انداز میں بیان کی گئی ہے۔ بچہ کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ ہر وقت ہاتھ پاؤں ہلاتا رہتا ہے۔ زبان سے جو کچھ کہتا ہے، اس کا مفہوم کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا شاعر نے خود زبان کو ''حرف بے مطلب'' قرار دیا ہے پھر بچہ چارپائی پر لیٹا ہوا اس وجہ سے پہروں چاند کو تکتا رہتا ہے کہ وہ ایک نہایت روشن چیز ہے اور اس کی روشنی سے آنکھیں چندھیاتی نہیں۔ پھٹے ہوئے بادل سے چاند گزرتا ہے تو واقعی آہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ مائیں عموماً بچوں کو لبھانے کے لیے کہتی ہیں کہ وہ دیکھو چاند میں پہاڑ ہیں اور بیابان میں بچے کچھ پوچھتے ہیں تو اُنھیں خوش کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کی کوئی بات کہہ دیتی ہیں اور وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ بچوں کی عام کیفیت ہے۔ آخری بند میں شاعر نے بچے کا نقشہ کھینچتے ہوئے تین باتیں جمع کر دی ہیں جو معجزے سے کم نہیں۔ یعنی اُس کی آنکھ ہر شے کو دیکھنے میں لگی رہتی ہے اس کے لب بات کرنا چاہتے ہیں اور دل میں یہ شوق رہتا ہے کہ سب کچھ پوچھ کر معلوم کر لے۔[۴]

اسی ضمن میں میرزا ادیب لکھتے ہیں:۔

بچے کی ساری خصوصیات ہمارے عام مشاہدے سے قطعاً مختلف نہیں ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور جب بچے کے بارے میں یہ بات کہتا ہے کہ ہر نیا بچہ جو دنیا میں آتا ہے یہ کہتا ہے کہ خدا ابھی انسانوں سے مایوس نہیں ہوا تو یہ قول شاعر کے اس مابعد الطبیعاتی نظریے کی عکاسی کرتا ہے جو اس نے بچے کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے اس کے برخلاف علامہ بیشتر بچے کی انھی باتوں اور حرکتوں کا ذکر کرتے ہیں جو عام مشاہدے میں آتی رہتی ہیں۔ گویا علامہ کے ہاں بچے کا تصور ایک ارضی بچے کے تصور میں صورت گیر ہوتا ہے اسمیں ماورائیت نہیں جیسا کہ ٹیگور کے ہاں ملتی ہے [۵]۔

جہاں تک ٹیگور کا تعلق ہے، میرزا ادیب نے ٹھیک کہا ہے کہ اقبالؒ کے ہاں اس قسم کے بچے کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ وہ نہ تو بچوں کو اڑتا ہوا دکھاتے ہیں نہ ہی بچوں سے مافوق الفطرت کام کرواتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ بلکہ ان کی نظموں میں تو وہ بچہ ہے جو اپنا بچپنا ساتھ لیے پھرتا ہے۔ یہ وہ عہدِ طفولیت ہے جس کی یادیں ہر انسان کا حسین سرمایہ ہوتی ہیں۔

یونانی اساطیر میں محبت کا دیوتا تاریک بچے کو دکھایا گیا ہے جس کے ہاتھ میں ایک تیر ہے جو جس پر بھی وار کرتا ہے وہ اسیرِ محبت ہو جاتا ہے۔ محبت کیا ہے اور بچے ہی کو محبت کا دیوتا کیوں بنایا گیا ہے۔

کسی پرندے، کسی شاخ کو، کسی پھول یا مظاہر فطرت میں کسی کو محبت کیوں نہیں سونپی گئی؟ یہ ایک نئی بحث ہے جو طویل ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کی نظموں سے دور ہٹتی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ محبت ایک جبلی جذبہ ہے جو صاف، واضح اور بے لوث بے لاگ ہوتا ہے۔ بچہ خود انھی مظاہر فطرت کا امین ہوتا ہے ذاتِ حق کا صحیح عکس ایک معصوم بچے کی شکل میں موجود ہے۔ جو سراسر خیر ہے۔ محبت ایک خیر کا جذبہ ہے جو گناہ و حقارت سے ماورا ہوتا ہے۔ لہٰذا بچے کا کردار ہی صحیح معنوں میں محبت کا علمبردار ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بچوں کی جن کیفیات کو دہرایا ہے وہ بچے کو ایک پاکیزہ شخصیت قرار دیتی ہیں۔ اور کسی شاعر کا ان کیفیات کی باز آفرینی کرنا اصل میں اس کے اندر Positivity کی طرف سفر کا آغاز ہے اور یہ دیکھا جا سکتا ہے۔ بچے کی نفسیات کو موضوع خاص بنا کر تخلیق نظم کرنا علامہ کے صرف آغاز میں ہی نظر آ رہا ہے۔ ''بانگِ درا'' کے بعد ''بالِ جبریل'' میں علامہ اس Positivity کے دوسرے مرحلے میں نظر آتے ہیں۔ اور اپنا آپ مکمل تلاش کر لیتے ہیں۔

عروس لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں

مگر میرزا ادیب ٹیگور کی ماورائیت کے برخلاف علامہ کی ان نظموں کو عام مشاہدہ قرار دیتے ہیں اور انھیں بچوں کی عام حرکات اور باتیں کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ کے ہاں ان نظموں میں بچہ کوئی ماورائی مخلوق نہیں بلکہ عام ارضی بچہ ہے مگر اس کی حرکات و سکنات سے جو مقصود ہے، وہ عام نہیں بلکہ وہ ایک بلیغ فکری مشاہدہ ہے۔ لہٰذا انھیں قلبی و ذہنی واردات کی باز آفرینی کہہ دینا علامہ کی نظموں کا درست ادراک نہ ہوگا۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے:

آنکھ وقف دید تھی، لب مائل گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوق استفسار تھا

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبار آرزو
آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرارِ آرزو

ہاتھ کی جنبش میں طرز دید میں پوشیدہ ہے
تیری صورت آرزو بھی تیری نو زائیدہ ہے

زندگانی ہے تری آزادِ قید و امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

تیری صورت، گاہ گریاں، گاہ خنداں، میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفل ناداں میں بھی ہوں

عہد طفلی میں آنکھ کا وقف دید رہنا، ہونٹوں کا مائل گفتار ہونا دراصل دل کا ذوق استفسار سے بھرا

ہونا تھا۔ کیا یہ عام مشاہدہ ہے؟ بچہ ہر وقت آنکھوں اور ہاتھ کو محوِ حرکت رکھتا ہے۔ مگر علامہ بچے کی اس ادا میں اس کی آرزو کا سراغ پاتے ہیں اور اس آرزو کو کچی آرزو قرار دیتے ہیں۔ بچے کا فرق و امتیاز کا پابند نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ رازِ قدرت سے آشنا ہے۔ کیا یہ عام مشاہدات ہیں؟ یقیناً عام مشاہدات نہیں بلکہ ان کے پیچھے گہرے حقائق کی فکری دریافت ہے جو ہمیں ان نظموں میں ملتی ہے۔ لہٰذا میرزا ادیب کا کہنا کہ یہاں محض عام طفلانہ یادیں ہیں درست نہیں بلکہ ان نظموں کے پس پردہ جو فکری و ذہنی سفر علامہ طے کر رہے تھے اس کی ایک اہم کڑی کو کم کر دینے کے مترادف ہے۔ یہاں جو "کشمکش آرزو" ملتی ہے وہ بعد میں علامہ کے فلسفہ حیات کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔

بچہ اور شمع میں علامہ کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں بچے کی نفسیات باریک فلسفیانہ موشگافیاں آشکارا کرتی ہے۔ پہلے بند میں بچہ شاعر کی گود میں لیٹا ہوا ہے جو شمع کو دیکھ رہا ہے اور شمع کو گاہے گاہے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے جو ایک عام مشاہدے کی بات ہے مگر علامہ اسے روشنی سے بغل گیری قرار دیتے ہیں۔

اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے
یہ کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے

روشنی کا ظہور بچے کے اندر پراسرار کیفیات کو جنم دیتا ہے اور وہ شمع کے شعلے کو بڑی حیرانی سے تکتا ہے علامہ نے یہاں یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ یہ روشنی اس نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہوئی ہے اور اب دوبارہ دیکھنے پر اسے پہچان گیا ہے وہ اس مانوسیت کے اظہار کے لیے اس کی طرف لپکتا ہے اور یہ ازلی سراپا نور ہونے کا ثبوت ہے۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

اس نظم کا بھی مرکزی نکتہ وہی ہے جو چاند کا ہے یعنی روشنی اور نور کی طلب...... نیز اس حقیقت کا اظہار کہ انسان خود سراپا نور ہے اور اس نے اپنے نور کو آگاہی کے پردے میں چھپا لیا ہے[۲]

دوسرے بند میں شاعر بچے اور شمع کا تقابل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شمع بھی نور ہے اور تو بھی سراپا نور ہے مگر تیرا نور زیرِ نقاب آگہی ہے جبکہ شمع عریاں جلوہ فرما ہے بچے کا شمع کے ساتھ تشبیہاتی رنگ بہت موزوں ہے۔ شمع جب روشنی کے عمل سے گزرنا شروع ہوتی ہے تو وہ ساتھ ساتھ تو اپنے اختتام کو روانہ ہوتی جاتی ہے۔

شمع کا ہر اگلا لمحہ اس کے انجام کے سفر کی طرف افسانہ ہے۔ یوں یہ سفر ایک متحرک روشنی کے قیام کا سبب ہے، مختصر مگر بھرپور............ علامہ بچے کے نفسیاتی پھیلاؤ میں اس متحرک روشنی کا عمل دیکھتے ہیں مگر وہ زیرِ نقاب آگہی ہے یوں بچے کو آگہی کے پردوں سے نکال کر شمع کی مانند چلنے کا جواب علامہ کے ابتدائی کلام ہی میں نظر آ رہا ہے۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

اگر انسان اپنی حقیقت پہچان لے ذاتی شعور کا پردہ آنکھوں سے اٹھا دے تو اُسے نظر آ جائے گا

کہ وہ سر سے پاؤں تک نور ہی نور ہے۔ ے

تیسرے بند میں علامہ دنیا کے ظاہری حسن کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں ہر نظارے میں حسن ہی حسن ہے۔ پہاڑوں کی ہیبت میں، سورج کے روشنی پھیلانے میں، رات کے اندھیرے سماں میں بھی ایک حسن ہے:

عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلکِ نا آشنا کی کوشش گفتار میں
چشمہ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن

مگر اس حسن کے تمام پھیلاؤ میں روح پھر بھی بے چین و بے قرار ہے وہ قافلے کی گھنٹی کی طرح فریادی کیوں بنی ہوئی ہے اور اُس کی زندگی ماہی بے آب کی طرح کیوں ہے؟ علامہ ان سوالات پر نظم ختم کر دیتے ہیں مگر ان کا جواب وہ دوسرے بند میں دے چکے ہیں:

شمع ایک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے
آہ اس محفل میں یہ عریاں تو مستور ہے
دست قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا!
تجھ کو خاک تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا
نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقابِ آ گہی!
ہے غبار دیدۂ بینا حجابِ آ گہی

اور اس حجاب کو ہٹانے کی تگ و دو وہ دنیا میں آتے ہی شروع کر دیتا ہے بچے کے شعلے کو دیکھتے رہنا، گود میں لیٹے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنا اور روشنی کی طرف لپکنا جیسے اس سے بغل گیری مدعا ہو۔ علامہ ان تمام حرکات کے پس پردہ نکات کو سامنے لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے وجود خاص کے مرکز کو ذات کا محور بنانے کی کوشش آنکھ کھلتے ہی شروع ہو جاتی ہے۔

اس ضمن میں علامہ کی نظم ''فراق'' بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے پہلے بند میں شاعر تنہائی کو ڈھونڈتے ہوئے پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہے۔ پہاڑ کے دامن میں آنا اور پھر کہیں چھپ جانا۔ تنہائی اور ایک خاموش تنہائی ہے:

شکستہ گیت میں چشموں کی دلبری ہے کمال
دعائے طفلک گفتار آزما کی مثال

وہ دیکھتا ہے کہ سامنے بہنے والے چشموں سے جو صدا آ رہی ہے وہ کسی سریلے گیت سے مشابہ ہے۔ بالکل اُس بچے کی دعا کی طرح جو ابھی بولنا سیکھ رہا ہو۔ جس میں مفہوم نہیں ہوتا بلکہ معصومیت اور

آواز میں رس بھرے ذائقے کا احساس ملا ہوتا ہے۔

غلام رسول مہر لکھتے ہیں:۔

چشموں کے گیت کو شکستہ اس لیے کہا کہ چلنے کی آواز کسی وقت سنائی دیتی ہے کسی وقت سنائی نہیں دیتی۔ یہ اقبال کی تصویر کشی کا کمال ہے پھر اسے بولنا سیکھنے والے بچے سے تشبیہہ دینا معجزے کا حکم رکھتا ہے۔[۸]

دوسرے بند میں بھی جدائی کے پس منظر میں علامہ کے روبرو بچے کی نفسیاتی کیفیات رہتی ہیں۔ یہاں ایک حیرت انگیز انداز میں جدائی کے لحات کی تشریح کی ہے:

یہ کیفیت ہے مری جانِ ناشکیبا کی
مری مثال ہے طفل صغیر تنہا کی

اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

یونہی میں دل کو پیام شکیب دیتا ہوں
شب و فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

شاعر کہتا ہے کہ جدائی کی اضطرابی کشمکش نے مجھے ایک ننھے بچے کی مانند کر دیا ہے۔ جب وہ کبھی تاریکی میں اکیلا ہوتا ہے تو گانا شروع کر دیتا ہے۔ ایک لے میں گنگنانے لگتا ہے دراصل وہ اس فعل سے سمجھتا ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی ہے جو اُسے بہلا رہا ہے۔ میری حالت بھی بالکل اسی طرح کی بنی ہوئی ہے میں حیلوں بہانوں سے دل کو صبر کا پیام دے رہا ہوں درحقیقت میں شب ہجر کو دھوکا دے رہا ہوں۔

بچے کا اکیلے میں گنگنانا اُس کی شعوری حسوں کا اطمینان ہے کہ اُس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ یہ اقبالؒ کے اُن آفاقی تجربات میں ایک ہے جو اسے عظیم شاعر بنا دیتے ہیں۔

علامہ کی ایک اور نظم ''ماہِ نو'' میں بھی بچے کی نفسیاتی کیفیت کو شعری جامہ پہنایا گیا ہے:

نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلک سیماب پا ہوں مکتب ہستی میں میں

پہلے بند میں علامہ چاند کو ایک ٹکڑا قرار دیتے ہیں جو آسماں کے آب نیل میں تیر رہا ہے۔ چاند کو حیرت انگیز تشبیہات کے ساتھ آسمان پر دکھایا گیا ہے۔ دوسرے بند میں علامہ چاند کے سفر کو بے آواز قرار دیتے ہیں۔ اُسے بے وطن کہہ کے اُس کے ساتھ چلنے کی آرزو کرتے ہیں اور پھر آخری ٹیپ کے شعر میں اپنے آپ کو سکول سے بھاگا ہوا بچہ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ کسی اور دنیا کا متلاشی ہے۔ اُس کے لیے اس بزم جہان میں اتنا مشکل ہو گیا ہے اب ساری نظم کا نچوڑ اُن کی آرزو میں سمٹ آیا ہے۔ اور اس آرزو کو سکول سے بھاگے ہوئے بچے کی نفسیات میں تلاش کرتے ہیں۔ سکول سے بھاگا

ہوا بچہ اپنے مکتب کی فضا سے اکتا چکا ہوتا ہے۔ اور اُس کا مرکز نجانے کیا ہوتا ہے۔ مگر اپنے ماحول سے دور ہونا اُس کا اولین مقصد بن چکا ہوتا ہے۔ یوں اس نفسیاتی کیفیت کا اپنی ذات کی اضطرابی کشمکش سے متشابہ قرار دینا علامہ کے کمالات میں سے ایک ہے۔

علامہ وسیع النظر فطرت شناس، وسیع المطالعہ فلسفی اور ایک عظیم پیامبر تو ہیں ہی، مذکورہ نظموں کے حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ ایک بہت بڑے ماہر نفسیاتِ اطفال (Child Psychologist) بھی ہیں۔ وہ بچوں کے افعال و کردار، بچوں کی نفسیات کے باریک گرہوں کو کھول کے جو حقائق ہمارے سامنے لاتے ہیں اس سے بچوں کی نفسیاتی کیفیات کا منظر نامہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔

حواشی

ا۔ احمد ندیم قاسمی، ''شعلۂ گل''، التحریر لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۸۷

۲۔ مائیکل کول (Michael Cole) *The Development of Children* سائنٹی فک امریکن بکس، امریکہ ۱۹۸۹ء، ص۱۲

۳۔ ایضاً، ص۱۳

۴۔ غلام رسول مہر: ''مطالب بانگ درا''، اسد پبلی کیشنز لاہور، ص ۲۱

۵۔ میرزا ادیب: ''مطالعہ اقبال، کے چند پہلو''، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۵ء ص ۲۰

۶۔ غلام رسول مہر: ''مطالب بانگ درا''، ص ۱۴۱

۷۔ ایضاً ص ۱۴۲

۸۔ ایضاً ص ۲۰۸